محمد خرم

اسکالر پی ایچ۔ڈی اردو، شعبہ اردو، سرگودھا یونیورسٹی، سرگودھا۔

ڈاکٹر عبدالواجد تبسم

استاد شعبہ اردو، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد۔

سوویت ادب اور ترقی پسندی

Muhammad Khurram
Scholar PhD Urdu, Department of Urdu, University of Sargodha, Sargodha.
Dr. Abdul Wajid Tabassum
Assistant Professor, Department of Urdu, AIOU, Islamabad.

Soviet Literature and Progressivism

Rapid change of foreground in the twenth century gave birth to many literary movements.The movement of progress authors introduced a new dimension on literary level.So, much was produced in fovour of lebourer and peasants.The authors related to progressive yearned to observe a change in social and political setup.Socialism and Russian social conditions provided firmed grounds as a background to such activity.Therefore a progressive author is established to be a promoter of socialism.
Key Words: *Literary, Movements, Progressive, Authors, Lebourer, Peasants, Socialism, Russian, Social, Conditions, Promoter.*

بیسویں صدی کے تیزی سے بدلتے ہوئے منظر نامے نے بہت سی تحریکوں اور انقلابات کو جنم دیا۔ معاشرتی اور سیاسی طور پر افراد اور معاشرے بنیادی شعور سے بہرہ ور ہوئے۔ معاشرے اور ادب دونوں کو زندگی کے نئے تقاضوں کے ساتھ مربوط کر دینے کی کوششیں ہونے لگیں۔ ادبی، سیاسی اور سماجی سطح پر ترقی پسند سوچ اور فلسفے نے حقیقتاً انقلاب برپا کر دیا۔ اِس انقلاب نے معاشرے میں موجود ہر اُس طاقت کو ہدف بنایا، جو کسی بھی سطح پر افراد یا سماج کا استحصال کر رہا تھا۔ چنانچہ مزدور اور کسان کی حمایت میں قلم متحرک ہو گیا اور سرمایہ دار اور جاگیر دار مقتدر طبقوں کے ظلم و ستم کا پردہ چاک کیا جانے لگا۔ یہ انقلابی سوچ ترقی پسند نظریات کی رہین منت تھی۔

ترقی پسند تحریک کے سماجی اور سیاسی مقاصد باہم مربوط تھے۔ یہ لوگ ادب کے ذریعے سماج میں سیاسی تبدیلی کے خواہاں تھے اور اس سیاسی نظام کے خلاف تھے جو مقتدر کو مضبوط اور محکوم کو مظلوم بنانے میں معاون

ثابت ہو رہا تھا۔ اِس سیاسی سرگرمی میں مارکس، اشتراکیت اور روس کے حالات پس منظر یا پیش منظر کے طور پر شامل رہے۔ اس لیے ترقی پسندی کو اشتراکیت کے پرچار اور مارکس کے نظریات کا داعی بھی سمجھا گیا۔ یہ مفروضہ کچھ ایسا غلط بھی نہ تھا کیونکہ خود ترقی پسند مصنفین نے اپنی پانچویں کُل ہند کانفرنس ۱۹۴۹ء منعقدہ بمقام بمبئی میں انجمن کے پُرانے منشور کو فرسودہ قرار دیتے ہوئے ایک نیا منشور ترتیب دیا جس کے ذریعے سے اعلانیہ طور پر ترقی پسند ادب کو اشتراکی سیاست کا ترجمان بنانے کی کوشش کی گئی اور ترقی پسند کہلانے کے لیے ملکی اور بین الاقوامی سیاسی حالات کو موضوع بنانا ضروری ٹھہرا۔[۱]

ترقی پسندوں کے لیے ملجا و ماویٰ روس کا اشتراکی نظام تھا۔ ۱۹۱۷ء کے انقلابِ روس نے عالمی سطح پر انقلاب برپا کیا۔ اِس انقلاب کی زد میں ادیب بھی آئے۔ روسی ادب خود بھی رجعت پسندانہ اقدار اور نظریات کی نفی میں تھا۔ انقلاب کے بعد اس کو مزید تقویت ملی اور اس کے اثرات برصغیر میں بھی محسوس اور قبول کیے گئے۔ ترقی پسند تحریک کی اساس میں یہی عالمی انقلاب اور بدلتی فضا کا اثر شامل ہے۔ ویسے بھی "اس زمانے کے روس میں اشتراکی حکومت کے قیام نے پوری دنیا کو متاثر کیا تھا۔ سیاسی نظریہ سازوں میں سے لینن اور مارکس اور ادیبوں میں سے طالسطائی اور گورکی نے نوجوانوں کے ذہن اور قلب پر بھرپور اثرات ڈالے تھے، جن سے مذہبی اقدار کو ٹھیس لگی اور مادے کو برتر حیثیت دی جانے لگی۔ قدیم رسوم کو رجعت پسندانہ قرار دیا گیا۔"[۲] چنانچہ افسانوں کی کتاب "انگارے" اور اختر حسین رائے پوری کا مضمون "ادب اور زندگی" قدیم تصورات اور رجعت پرستی کے بُت کو توڑتے ہیں۔ ان تخلیقات نے برصغیر کی سیاسی اور ادبی زندگی میں ہلچل مچادی۔ اختر حسین رائے پوری نے اپنے مضمون "ادب اور زندگی" میں گورکی اور طالسطائی کے خیالات کو اُردو دان طبقے میں متعارف کرایا، نیز ۱۹۳۵ء میں پیرس میں آندرے مارلو، رومین رولاں اور گورکی کی رہنمائی میں ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد ہوئی۔ اِسی کانفرنس سے متاثر ہو کر سجاد ظہیر، ڈاکٹر تاثیر اور ملک راج آنند نے لندن کے نانکنگ ریستوران میں ترقی پسند انجمن کا پہلا اعلامیہ مرتب کیا۔[۳] ابتدائی ترقی پسند مصنفین بھی روس کے اشتراکی نظام اور نظریات سے متاثر نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ روسی ادب اور ادباء پر اختر حسین رائے پوری، آل احمد سرور، عبدالعلیم وغیرہ کے باقاعدہ مضامین آتے ہیں جبکہ دیگر مصنفین کے ہاں اس موضوع کے اشارے ملتے ہیں۔ لینن، گورکی، کارل مارکس اور فریڈرک اینجلز اُردو ادب میں اپنی جھلک دکھانے لگے۔ آل احمد سرور اپنے مضمون "گورکی کا اثر اُردو ادب پر" میں روسی اشتراکیت کے اثرات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

> "ہندوستان کے دوسرے ادیبوں کی طرح اُردو کے ادیب بھی عالمی اثرات کو جذب کر رہے تھے اور نیا نظریاتی و تحقیقی سیلاب اُمڈ رہا تھا۔ ترقی پسند خیالات ایک تحریک کی صورت اختیار کرنے والے تھے۔ ان خیالات کو گورکی کے افکار سے بڑی مدد ملی۔ گورکی کے انتقال سے کچھ پہلے منٹو نے روسی افسانے کے عنوان سے افانسیف، ٹالسٹائی، چیخوف، گورکی، سلوگب، چریکوف کے افسانوں کے ترجمے شائع کیے جس پر مشہور انقلابی مصنف باری نے مقدمہ لکھا۔"(۴)

انقلاب روس کے نتیجے میں زار کی سلطنت کا تختہ اُلٹ دیا گیا اور ملک میں درانتی ہتھوڑے کے پرچم کو لہرایا جانے لگا۔ کسانوں، مزدوروں اور عام عوام کو اہمیت دی گئی۔ ظالم حکمرانوں سے نجات پر جشن منائے گئے۔ ظالم سے نجات اور پسے ہوئے طبقے کی بالادستی جیسے انقلاب آفریں خیالات برصغیر کے سیاسی حالات کے ساتھ بھرپور مطابقت اختیار کر گئے۔ چنانچہ آزادی کی تحریک کو ادباء نے ترقی پسندانہ نظریات کے ذریعے فعال کیا۔ ترقی پسند تحریک کوئی باقاعدہ سیاسی یا آزادی کی تحریک نہ تھی، بلکہ یہ ایک ادبی تحریک تھی جو سیاسی مقاصد کی حامل تھی۔ وہ بھی اس طرح کہ ادب کے ذریعے سماج دشمن عناصر کو بے نقاب کرنا اور مظلوم کو اُس کا حق دلوانا اِس کا منشور ٹھہرا۔ یہ منشور انقلاب روس اور روسی مصنفین کی تحریروں سے ماخوذ تھا، کیونکہ "جب عالمی سطح پر رونما ہونے والی تبدیلیوں کے نتیجے میں چوتھی دہائی کی ترقی پسند تحریک نے ہندوستانی ادیبوں پر بھی اپنے اثرات ثبت کیے تو اس نے مارکسزم اور لینن ازم دونوں سے تقویت حاصل کی۔ برٹرینڈ رسل نے مارکسزم کو بجا طور پر تاریخ کی سائنس اور سائنس کی تاریخ کہا ہے۔ ایک فلسفے کی حیثیت سے مارکسزم نے تخلیقی ادیبوں اور ادب کے نقادوں کو خاصا متاثر کیا ہے۔"(۵)

انقلاب کے بعد مارکسزم اور سوشلزم نے روسی ادب کو مقصدیت کے ساتھ منسلک کرنے کے علاوہ عالمی سطح پر بھی ادب کو متاثر کیا۔ بطورِ خاص وہ ممالک جو فاشسٹوں کی آبادیوں کی صورت میں بنیادی حقوق کو ترس رہے تھے۔ اس انقلاب اور انقلابی ادب نے اِن ممالک کے لوگوں کو اپنے حقوق کے لیے ترسنے کی بجائے انہیں حاصل کرنے کے شعور سے روشناس کرایا۔ ادباء نے اس مقصد کو لے کر ادب تخلیق کرنا شروع کر دیا چونکہ ایسے ادب میں انقلاب کے داعی کارل مارکس، لینن، اینجلز وغیرہ کی بازگشت سنائی دینے لگی اس لیے ایسے ادب کو انقلاب روس،

مارکسزم، اشتراکیت اور سوشلزم جیسی اصطلاحات سے مربوط کر دیا گیا۔ اِس کے تحت تخلیق ہونے والا روسی ادب بھی زندگی، سماج اور سیاست کے مقصد کو پیشِ نظر رکھنے لگا۔

ہندوستان میں یہی مقصدیت ترقی پسند تحریک کے زیرِ عنوان نشر ہونے لگی۔ انقلاب روس کے تحت مقصدی نظریات کا پرچار ہندوستان میں پذیرائی اختیار کرنے لگا۔ اِس کی واضح ابتداء پہلی جنگِ عظیم کے نتیجے میں پیدا ہونے والے سیاسی منظر نامے سے ہوئی۔ پروفیسر ممتاز حسین کے بقول:

> "پہلی جنگِ عظیم کے بعد جب سوویٹ روس نے سرمایہ دارانہ نظام ہی کا تختہ اُلٹ دیا تو جہاں دنیا کے اور ملکوں میں اٹوپین سوشلزم کو چھوڑ کر، اس سائنٹفک سوشلزم کے اختیار کرنے کا جذبہ اور اس کی جدوجہد بڑھی، اسی طرح ہندوستان بھی اسی روسی انقلاب سے متاثر ہوا چنانچہ علامہ اقبال، ٹیگور اور منشی پریم چند یہ تینوں ہی اس انقلاب سے متاثر ہوئے۔ جس کا اظہار ان کے یہاں اس طرح ہوتا ہے کہ ان تینوں ہی نے سرمایہ داری نظام کو انسانی اور اخلاقی نقطۂ نظر سے مسترد کر دیا۔"[۶]

انقلاب روس جدید خیالات اور نظریات کا حامی تھا۔ صدیوں سے قائم جبر و تسلط کی سیاست کو اُلٹنے کے ساتھ ساتھ سماج اور ادب میں بھی رجعت پسندی کو مذموم قرار دیا گیا۔ ادب کا فریضہ پرولتاری سوچ کو پروان چڑھانا اور کمیونزم کی راہ کو ہموار کرنا ٹھہرا۔ یہاں پر ایک نئی کشمکش رجعت پسندی کے ہونے اور نہ ہونے کے حوالے سے جنم لیتی ہے کیونکہ ۱۹۱۷ء کے انقلاب کا تقاضا تھا کہ سیاسی و اقتصادی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ تہذیبی و تمدنی تشکیل بھی نئے انداز سے ہو۔ لہٰذا سرمایہ دارانہ اور فاشزم کے تمام اثرات اور نظریات کو نیست و نابود کر دینا لازمی سمجھا جانے لگا۔ یہ مطالبہ شعر و ادب سے بھی ہونے لگا کہ وہ پرولٹیرین جامہ پہن کر کمیونزم کو فروغ دے۔ اس طرح کمیونسٹ ادب کو کمیونسٹ انقلاب کے استحکام کی ضمانت قرار دیا گیا۔ ہر اس ادیب کا قلم چھیننے کی فکر ہونے لگی جو کسی بھی قسم کی رجعت پروری سے کام لیتا ہو اور اس مقصد کے تحت سرکاری سرپرستی میں "پرولٹ کلٹ" پرولٹیرین کلچر کا مخفف کے نام سے ایک ادارہ بھی قائم کیا گیا جس کی نگرانی میں متعدد رسائل و جرائد کمیونسٹ ادب کی آبیاری کرنے میں مصروفِ عمل ہوئے۔[۷]

برصغیر میں بھی روس کی سیاسی اور آدرشتی فضا اپنے بھرپور اثرات کے ساتھ داخل ہوئی۔ تقسیم ہند سے قبل اور بعد کے زمانے میں بھی مختلف ناقدین ادب میں ترقی پسندی، اشتراکیت، سوشلزم، سماجی مسائل کے بیان، زندگی کی تلخ حقیقتوں کو بے نقاب کرنے اور دیگر سیاسی مسائل پر اظہارِ خیال کے حوالے سے بحث عام رہی۔ اِن ناقدین میں سے بیشتر نے ادب برائے زندگی کی صدا کا ساتھ دیا۔ اِس مقصد کے تانے بانے انقلاب روس سے ہی جا ملتے ہیں اور لینن، گورکی، کارل مارکس، فریڈرک اینجلز کے نظریات اس مقصد کو اساس فراہم کرتے ہیں۔ برصغیر میں ترقی پسند ادباء میں سے بیشتر تو مارکس کے خیالات کو اپنانے اور ادب کو اِسے رائج کرنے کا ذریعہ قرار دینے والوں میں سے ہیں، تاہم چند ایک نے ادب کا کام سماجی مسائل کی عکاسی تو ضرور قرار دیا، مگر اسے محض سیاست یا اشتراکیت کے ساتھ ہی مربوط کر دینے کو احسن خیال نہیں کیا۔ اِن میں سے چند اہم ناقدین کے خیالات پر ایک مختصر نگاہ ڈالتے ہیں تا کہ ادب، زندگی، سیاست، ترقی پسندی اور اشتراکیت کے تصورات کی تفہیم سہل ہو سکے۔

اُردو میں ترقی پسندانہ سوچ یعنی ادب برائے زندگی کی اوّلین اور واضح آواز اختر حسین رائے پوری کے مضمون ''ادب اور زندگی'' میں سنائی دیتی ہے۔ اِس مضمون میں اختر نے ادب کو زندگی کا آئینہ دار اور پروردہ قرار دیا۔ جولائی ۱۹۳۵ء میں سہ ماہی اورنگ آباد میں شائع ہونے والا ان کا اولین مقالہ ''ادب اور زندگی'' ترقی پسند تنقید کا نقطۂ آغاز ہے۔[۸] اختر کی اِس سوچ کے پیچھے سوشلزم کے واضح اثرات تھے۔ روس سے اُبھرنے والے اس انجام نے بہت جلد دنیا کے اہلِ بصیرت کو متاثر کرنا شروع کر دیا تھا۔ سوشلزم پسے ہوئے سماج کے لیے ایک ایسے دیوتا کا روپ دھارتا جا رہا تھا جو اُن کے ہر مسئلے کو حل کر سکنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اختر حسین رائے پوری ابتدائی عمر میں ہی سوشلسٹ فلسفے سے متاثر ہوئے اور اس کا اعتراف کرتے ہوئے وہ رقم طراز ہیں کہ:

> ''گردِراہ'' میں مَیں نے لکھا ہے کہ میں سوشلزم اور جمہوریت کو جدید تمدن کے دو بنیادی ستون سمجھتا ہوں۔ اپنی نوجوانی کے دنوں میں مَیں سوشلسٹ فلسفے سے بہت متاثر ہوا تھا اور میں نے ان تحریروں کو بھی کسی حد تک پڑھا ہوا تھا، جنھیں اس وقت کے حساب سے آپ جدید ادب کہہ سکتے ہیں۔''[۹]

اختر حسین رائے پوری نے اِسی جدید ادب سے متاثر ہو کر اُردو میں ترقی پسند تنقید کو فروغ دیا اور ادب کو اِسی تناظر میں پرکھنے نیز ادب کو اِسی مقصد کے لیے تخلیق کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ اِسی لیے اختر نے ہر ایمان دار

اور صادق ادیب کے لیے یہ ضروری قرار دیا کہ وہ قوم وملت اور رسم و آئین کی پابندیوں کو ہٹا کر زندگی کی یگانگی اور انسانیت کی وحدت کا پیغام سنائے، اسے رنگ و نسل اور قومیت و وطنیت کے جذبات کی مخالفت اور اخوت و مساوات کی حمایت کرنی چاہیے اور ان تمام عناصر کے خلاف جہاد کا پرچم بلند کرنا چاہیے جو دریائے زندگی کو چھوٹے چھوٹے چو بچوں میں بند کرنا چاہتے ہیں۔(۱۰)

اختر حسین رائے پوری کے بعد "ادب اور زندگی" کے عنوان سے ہی مضمون لکھ کر مجنوں گورکھ پوری نے ترقی پسند تنقید اور سوچ کو مزید آگے بڑھایا۔ یہ مضمون بعد ازاں اِسی عنوان یعنی "ادب اور زندگی" کے تحت دیگر مضامین کے ساتھ کتابی صورت میں بھی شائع ہوا:

> "مجنوں گورکھ پوری ۱۹۳۶ء سے باقاعدہ طور پر نظریاتی تنقید کے میدان میں آئے۔ وہ بقول خود مارکس کے مطالعے سے بہت پہلے زندگی کی جدلیات کا احساس رکھتے تھے۔ ادب اور زندگی، نیا ادب کیا ہے، ادب اور ترقی، ادب کی جدلیاتی ماہیئت، نئی اور پرانی قدریں، تخلیق اور تنقید، حُسن اور فن کاری، شعر اور غزل اور ادب اور مقصد جیسے مضامین نظریاتی تنقید میں بنیادی حیثیت کے حامل ہیں اور مجنوں کی کتاب، ادب اور زندگی میں شامل ہیں"(۱۱)

مجنوں گورکھ پوری ادب کو زندگی کی جدلیاتی اقدار سے استوار کرنے کے قائل ہیں۔ اِس لحاظ سے وہ مارکسی نقطۂ نظر کے قریب ہیں۔ مجنوں ادب کو محض جمالیات سے ہی منسلک نہیں رہنے دیتے بلکہ اس میں جمالیات کے ساتھ ساتھ افادیت اور حقیقت کو بھی اہمیت دینے کی تلقین کرتے ہیں۔ مجنوں کے نزدیک ادب کے متعلق سوالات کے جوابات کو اب دل نشیں بلکہ دماغ نشیں ہونا ہے کیونکہ آج محض حُسن کاری کو ادب نہیں کہا جا سکتا۔ ادب اگر ملک وزمانے کی تازہ ترین فکریات idealogy یعنی اجتماعی خیالات وافکار کا حامل نہیں ہے تو وہ صحیح معنوں میں ادب نہیں ہے۔ اب یہ حقیقت ہے کہ حسن خیر اور حقیقت تینوں ایک آہنگ بنا کر پیش کرنے کا نام ادب ہے۔(۱۲)

مجنوں نے اپنی تنقید میں جمالیات اور مقصدیت دونوں حوالوں کا احترام کیا ہے۔ وہ میتھیو آرنلڈ کے اس قول کی تائید کرتے ہیں کہ ادب زندگی کی تنقید ہے اور اسے مزید آگے بڑھاتے ہوئے ادب کو جماعت اور افراد کی

زندگی کی نہ صرف تصویر بلکہ تنقید بھی قرار دیتے ہیں۔۱۳؎ گویا مجنوں ادب کے متعلق اُس تصور کی تائید کرتے ہیں جو ادب کو تنقیدِ حیات قرار دیتا ہے لیکن وہ اِس نقدی وظیفہ کے لیے جمالیاتی اقدار کو بھی لازم قرار دیتے ہیں۔ اِس طرح مجنوں ادب کو زندگی کا جمالیاتی ترجمان بنانے پر زور دیتے ہیں۔ اس تصور کے سوتے بھی مارکسی نقطۂ نظر سے ہی پھوٹتے ہیں جس کا اعتراف کرتے ہوئے خود مجنوں رقم طراز ہیں کہ:

"سب سے پہلے مارکس اور انگلز نے ہم کو اس حقیقت سے آگاہ کیا کہ حسن کاری اور ادب ہیئت اجتماعی اور نظام تمدن کی خدمت میں آلۂ نشر و تبلیغ ہوتے ہیں اور چونکہ تہذیب و تمدن کا اجارہ اب تک طبقۂ اعلیٰ یا سرمایہ داروں کے ہاتھ میں رہا اس لیے ہمارے ادیب اور شاعر اب تک جس تہذیب کی نمائندگی کر رہے تھے وہ اقلیت کی تہذیب تھی اور صرف ایک کم تعداد فراغت نصیب جماعت کی پیدا کی ہوئی چیز تھی جس کو جمہور کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔"(۱۴)

اِسی لیے تمدنی اور ادبی دونوں سطح پر انقلاب کی ضرورت ہے اور ادب کو اِسی انقلاب آفرینی کے لیے سرگرم عمل ہونا چاہیے۔ اس طرح کے خیالات سید احتشام حسین اور ممتاز حسین کے ہاں بھی نظر آتے ہیں۔

سید احتشام حسین کی سنجیدہ طبعی کے باعث ان کی تحریروں میں پختگی نظر آتی ہے۔ وہ مارکسی نقطہٗ نظر کے بھرپور قائل نظر آتے ہیں اور ادب کو زندگی کی جدلیاتی حرکت سے مربوط کرتے ہیں۔ سید احتشام حسین مارکسی تنقید اور نقطہٗ نظر کے حوالے سے معروف ہیں۔ اِسی لیے نظری اور عملی دونوں زاویوں سے وہ ترقی پسند نقطۂ نظر کے اہم ناقدین میں شمار ہوتے ہیں جس کی بنیادی وجہ اُن کا اشتراکی نظریات کو بہت کھلے ہوئے انداز میں پیش کرنا ہے۔۱۵؎ احتشام حسین، مجنوں گورکھ پوری کی طرح زندگی کے مادی مسائل کو بیان کرنے کے لیے جمالیات کو ضروری قرار نہیں دیتے بلکہ وہ زندگی کو ایک نامیاتی وحدت میں ڈھلا ہوا تصور کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک مقالہ نگار کے نزدیک احتشام حسین ایک مارکسی نقاد کے لیے ہیئت اور مواد کے حوالے سے جمالیاتی اقدار کو زیادہ اہمیت دینے کی بجائے مادہ، مقدار اور جدلیات کو زیادہ اہمیت دینے کی ضرورت پر زور دیتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک فن کا مقصود ''مواد'' ہے جب کہ ہیئت تو محض ایک وسیلہ ہے۔(۱۶) احتشام حسین کی بیشتر تحریریں اسی تصور کی تشریح کرتی نظر آتی ہیں۔ وہ اپنی تصنیف ''ذوقِ ادب اور شعور'' میں رقم طراز ہیں:

"ہر لمحہ بدلتی ہوئی اور متحرک دنیا میں حقائق کی اصل نوعیت کا گرفت میں لانا آسان نہیں۔ حقائق کو سمجھنے کے لیے جدلیاتی نقطۂ نظر چاہیے۔ ظاہر ہے کہ یہ چیز حقیقت نگاری کے معمولی تصور سے بالکل مختلف ہے۔ اس میں تاریخی حقیقت، احساسِ فن اور تصورِ زندگی سب مل کر ایک ہو جاتے ہیں۔ یہی ادب کا مادی تصور ہے جو فن کے تنوع کا مخالف نہیں ہے۔ جدت برائے جدت ہیئت پرستی کا مخالف ہے۔"(۱۷)

سید احتشام حسین مواد کو ہیئت پر ترجیح دیتے ہیں۔ اِس طرح ادب کو خالصتاً مقصدی بنانے پر زور دیتے ہیں۔ اس کے برعکس ممتاز حسین ایسے ترقی پسند نقاد ہیں جو تحریر کو مارکسیت کے تناظر میں تو تولتے ہی ہیں، مگر ترقی پسند ادیبوں کی تحریروں میں محض مقصدیت کی کوتاہیوں کو بھی تنقیدی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ وہ تخیل اور حقیقت کو اہمیت دیتے ہیں تو جمالیاتی حظ اور افادیت، کے بھی قائل ہیں۔ وہ عوامی ادب، ترقی پسند ادب جیسے موضوعات کے علاوہ ادب اور شخصیت، فن اور فطرت کے موضوعات کو بھی احاطۂ تحریر میں لاتے ہیں۔ لہٰذا ان کے ہاں سماج کی معاشی و سیاسی اقدار فلسفہ و سائنس اور اساطیر کا بھرپور شعور ملتا ہے۔ اِسی طرح وہ ادب کو زندگی اور جمالیات دونوں سے مربوط کرتے ہوئے اِس کا رشتہ سماجی قدروں سے جوڑتے ہیں کیونکہ ممتاز حسین کے نزدیک:

"تنقید کے لیے صرف ادبی ذوق، ادبی مطالعہ کافی نہیں ہے کیونکہ اقدار کی تنقید مختلف علوم اور دوسری چیزوں کا احاطہ چاہتی ہے۔ جن میں معاصر زندگی کی قدروں کا زندہ رشتہ اور احساس سب سے زیادہ اہم ہے۔ اس لیے ناقد کو اپنے عصر، اپنی سوسائٹی کی اقتصادی، سیاسی جدوجہد اور علوم متداولہ سے باخبر ہونا چاہیے۔"(۱۸)

خود ممتاز حسین عصری شعور اور تحرک سے بخوبی واقف تھے۔ اِسی لیے وہ مارکسی فلسفے کے تحت ادب کو زندگی کا پروردہ بنانے کے لیے کوشاں رہے۔ ممتاز حسین نے اِس مقصد کے لیے مارکس کے علاوہ دیگر مشرق و مغرب کے فلسفے کو بھی سمجھنے کی کوشش کی۔

عہدِ جدید میں ادب کو زندگی کے لیے سرگرم ہونے کا نعرہ بلند کرنے والوں میں ایک اہم ترقی پسند نام ڈاکٹر محمد علی صدیقی کا ہے۔ انھوں نے مغربی ادب تک رسائی اور جدید تحریکوں سے اثر قبول کر کے ادب کو زندگی کا ترجمان قرار دیا۔ اپنی تصانیف "توازن" اور "نشانات" میں تخلیقات کے سیاسی و سماجی پس منظر، ادب کے عصری

تقاضے، ادب اور روایت، جمہوری اقدار اور دیگر جدید مباحث پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی کی خصوصیت یہ ہے کہ اُنھوں نے ادب اور زندگی کے تناظر میں روایتی ترقی پسند نظریات میں جہاں سقم محسوس کیا وہاں درستی کی بھی کوشش کی۔ اُن کے ہاں زندگی، ادب اور حالات تغیر پذیر اقدار ہیں۔ جو افراد کے تعلق کے ساتھ حرکت پذیر ہوتی ہیں۔ اس لیے وہ خود ترقی پسند تحریک کا غیر جانبدارانہ تجزیہ کرتے ہوئے اعتراف کرتے ہیں کہ:

> "ترقی پسند تحریک کے ہر اوّل دستے نے نقد ادب کے سلسلے میں جو پیمانے وضع کیے تھے ان میں ایک واضح جھول تھا۔ انھوں نے ادب کیا ہونا چاہیے، پر اس قدر زور دیا کہ وہ اس نکتے سے بہت آسانی سے گزر گئے۔ انھوں نے اس مسئلہ پر توجہ نہ دی کہ بعض زوال پسند ادبا کی جانب سے جس قسم کے ادب پر اصرار کیا جا رہا ہے اُس کے سوتے کس منبع فکر سے پھوٹ رہے ہیں۔ اگر وہ زوال پسند ادب کے بارے میں اس طرح غور کرتے کہ یہ ادب اپنی جگہ زندگی بے زار سہی لیکن اس کے باوجود ایک آلہ "بادِپیما" یا زوال آمادگی کی علامات کے صحیح تجزیے کے لیے دلیل کا حکم رکھتا ہے تو زیادہ بہتر رہتا۔"(۱۹)

ڈاکٹر محمد علی صدیقی ترقی پسند تحریک میں بھی رجعت پسندی اور روایت پرستی کی بجائے جدید نظریات کو اپنانے کے خواہاں ہیں۔ وہ اس امر میں تنقید کو بھی فلسفے کی باقاعدہ شاخ سمجھتے ہیں اور اسے محض آہ اور واہ کے تاثراتی نظام سے پاک رکھنا چاہتے ہیں۔ اِسی لیے ڈاکٹر محمد علی صدیقی ادب کے سماجی منصب کے بارے میں نہ تو فرانس کے زوال پذیر ادبا کی آراء سے اتفاق رائے کر سکے اور نہ ہی بعض ترقی پسند نقادوں کی ملائیت سے کبھی متفق ہو سکے۔(۲۰)

اِس ساری بحث کے بعد یہ حقیقت واضح طور پر آشکار ہوتی ہے کہ ادب زندگی کا آئینہ دار ہوتا ہے، مگر اس مقصد کے لیے ادب کو ادب بھی ہونا چاہیے اور ادب بغیر جمالیاتی اقدار کے ادب نہیں ہو سکتا۔ اس صفت کے بغیر ادب محض ایک تحریر بن کے رہ جائے گا۔ نیز ادب زندگی کی سب سے اہم شاخ سیاست کی ترجمانی اور اثر پذیری کے بغیر بھی ادھورا ہے۔ اسی لیے ادب، زندگی اور سیاست کے تعلق کے تناظر میں پوری ترقی پسند تحریک جنم لیتی ہے۔ قیامِ پاکستان سے قبل اور بعد میں بھی اِسی تحریک کے حق اور مخالفت میں ادب، زندگی اور سیاسی اقدار پر بحث و مباحثے کا سلسلہ چل نکلا۔ تنقید، شاعری اور فکشن کے میدان میں مقصدیت اور ترقی پسندی کے حوالے سے خامہ

فرسائی کی گئی۔ بطورِ خاص اُردو ناولوں میں ترقی پسندی اور سیاسی موضوعات کو پس منظر اور پیشِ منظر کے طور پر پیش کیا جانے لگا۔ اس طرح یہ جدید ادبی فضا جو روایت اور جدیدیت، روحانیت اور مادیت کے سنگم سے پھوٹ رہی تھی، بالغ نظر ناقدین کی نگاہ میں قابلِ تحسین ٹھہری۔ جس کا اعتراف ڈاکٹر محمد علی صدیقی کے اس اقتباس سے ہوتا ہے:

> "ہمارا موجودہ ادب ملک اور قوم کی روحانی اور مادی ترقی کو ایک دوسرے سے متصادم تصور نہیں کرتا۔ آج کے ادب کا طرۂ امتیاز ہی یہ ہے کہ وہ ملک کے سیاسی مسائل کو قرار واقعی اہمیت دیتا ہے اور اپنی تخلیقات کو خیر و شر کے ڈرامہ میں بطور شہادت پیش کرتا ہے۔ حسن کاری اور انسان دوستی کا تصادم کن طاقتوں سے ہو سکتا ہے۔ ان کی سیاست کو سمجھنا اور تخلیقی تحریروں میں ذہن پر ثبت شدہ اثرات کی تحلیل کرنا ہی ادب ہے۔ اس کے علاوہ وہ جو کچھ ہے وہ نیم ادب ہے جو ترکاری کی طرح زود فنا ہے۔"[۲۱]

ایک ادیب جس معاشرے میں زندگی بسر کرتا ہے۔ اُس کی حقیقتوں سے کٹ کر نہیں رہ سکتا۔ وہ ارد گرد کے ماحول اور اُس میں وقوع پذیر سیاسی، سماجی، ثقافتی، سائنسی غرض ہر طرح کی تبدیلیوں سے متاثر ہوتا ہے اور پھر اس کا اظہار الفاظ کی صورت میں کرتا ہے۔ لہٰذا ادب کے مفہوم، دائرۂ کار، ادب برائے زندگی، ادب اور سیاست، ادب اور جمہوریت، ادب اور ترقی پسندی، سوویٹ ادب اور ترقی پسندی جیسے مباحث کا جائزہ لینے کے بعد یہ حقیقت ضرور سامنے آتی ہے کہ ادب زندگی کا ترجمان ہوتا ہے، مگر اس ترجمانی میں جب تک اسلوب کی چاشنی شامل نہ ہو گی تو ادب کا وجود ہی سوالیہ نشان بن کر رہ جائے گا۔ لہٰذا عمدہ فن پارے کے لئے ضروری ہے کہ وہ زندگی کے گوناگوں مسائل کا بیان ادبی اور جمالیاتی اقدار کے سانچے میں ڈھل کر کرے۔

حوالہ جات

۱۔ ڈاکٹر حیات افتخار، اُردو ناولوں میں ترقی پسند عناصر، لکھنو: نسیم بُک ڈپو،۱۹۸۸ء، ص ۴۱، ۴۰

۲۔ ڈاکٹر انور سدید، اُردو ادب کی مختصر تاریخ، لاہور: عزیز بک ڈپو،۱۹۹۸ء، ص ۴۲۶

۳۔ ایضاً، ص ۴۲۷

۴۔ آل احمد سرور، نظر اور نظریے، کراچی: اُردو اکیڈمی سندھ،۱۹۸۷ء، ص ۲۲۶

۵۔ ایضاً، ص ۲۴۱

۶۔ پروفیسر ممتاز حسین، ادب اور شعور، کراچی: اُردو اکیڈمی سندھ،۱۹۶۱ء، ص ۲۵۶

۷۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، ادب اور انقلاب، بمبئی: نیشنل انفارمیشن اینڈ پبلی کیشنز لمیٹڈ، س ن، ص ۱۰۲

۸۔ ڈاکٹر خالد ندیم، اختر حسین رائے پوری: حیات وخدمات، لاہور: مجلسِ ترقی ادب،۲۰۰۹ء، ص ۱۹۸

۹۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، "مقدمہ"، مشمولہ، افکار، کراچی مئی ۱۹۸۶ء، ص ۴۱۱

۱۰۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، ادب اور انقلاب، ص ۲۵

۱۱۔ محمد علی صدیقی، مضامین کراچی: ادارہ عصرِ نو،۱۹۹۱ء، ص ۱۱۷

۱۲۔ مجنوں گورکھ پوری، "ادب اور زندگی"، مشمولہ، ادب، زندگی اور سیاست، مرتبہ محمد خاور نوازش، فیصل آباد: مثال پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء، ص ۱۶۸

۱۳۔ مجنوں گورکھ پوری، "مبادیاتِ تنقید"، مشمولہ، اردو نثر کا فنی ارتقاء، مرتبہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری، لاہور: الاعجاز پبلی کیشنز،۲۰۰۷ء، ص ۲۵۴

۱۴۔ ایضاً، ص ۲۵۱

۱۵۔ ڈاکٹر وحید قریشی، اردو نثر کے میلانات، لاہور: مکتبہ عالیہ،۱۹۸۶ء، ص ۸۹

۱۶۔ مسز نذیر بیگم، اُردو میں تنقید کا عمرانی دبستان، تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی اُردو، بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان، ۲۰۰۲ء، ص ۱۴۵

۱۷۔ سید احتشام حسین، ذوقِ ادب اور شعور لکھنو ادارہ فروغِ اُردو، ۱۹۵۵ء، ص ۱۰۳

۱۸۔ پروفیسر ممتاز حسین، ادب اور شعور، ص ۱۳۷

۱۹۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی، نشانات، کراچی: ادارہ عصر نو، ۱۹۸۱ء، ص ۱۳

۲۰۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی، توازن، کراچی: ادارہ عصر نو، ۱۹۷۶ء، ص ۹

۲۱۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی، "ادب اور سیاست،" مشمولہ ادب، زندگی اور سیاست، ص ۳۸۲